ڈاکٹر تبسم کاشمیری

دی گولڈن کام (The Golden Calm): آخری مغلیہ دور کی دلی کی یادیں

"The Golden Calm" - memoirs of Emily is one of the major and primary sources to look at the social and political picture of Delhi in Akber Shah Sani and Bahadur Shah Zafar's period. Emily was the elder daughter of Sir Thomas Metcalfe - one of the residents of Delhi. "Reminiscences of Imperial Delhi" was the title given to this book by Sir Thomas Metcalfe but now it has been published with title "The Golden Calm". The article represents the introduction and history of this book.

"سفر دلی کی آخری منزل اب شروع ہو چکی تھی۔ میں اپنے اندر ہیجان محسوس کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ پو پھٹنے سے پہلے ہی میں اپنے باپ سے مل سکوں گی۔ رات کے تقریباً ایک بجے میں نے اپنی پالکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو تاب ناک چاندنی میں مسجد جامع کے بلند و بالا مینار نظر آئے۔ یہ مسلمانوں کی عظیم مسجد تھی، شمالی ہند اور دلی کی خوب صورتی کا یہ حصہ ہے۔ جوں جوں ہم شہر کے قریب ہوتے گئے مجھے شہر کے گرد سرخ فصیل نظر آنے لگی۔ میں نے پھر محسوس کیا کہ میں اپنے گھر پہنچنے ہی والی ہوں میں اس احساس سے مسحور ہو رہی تھی کہ میرے باپ کے پرانے نوکر سڑک پہ خوش آمدید کہنے کے لیے کھڑے ہوں گے۔ میری زندگی کی یہ سب سے شان دار چاندنی رات تھی۔ جوں ہی ہم نے دریا عبور کیا ہمیں دونوں طرف شہر کا منظر نظر آیا۔ یہ بہت شان دار نظارہ تھا مسلمانوں کی مساجد کے نفیس مینار آسمان کی سمت بلند ہو رہے تھے۔ شہر، شہر کی کنگرے دار دیواریں، اس کے محلات، گنبد اور مینار، دمکتی ہوئی جمنا کی پٹی اور اس کے سفید ریتلے کنارے ہمیشہ کی طرح مسحور کن منظر پیش کر رہے تھے۔ یہ ایک طلسمی منظر تھا۔ رات کے دو بجے ہر شے روشن نظر آ رہی تھی۔ شہر کی دیواروں کی گہری سرخی اور عمارتیں مکمل سکوت اور آرام میں گم تھیں۔ گھر میں داخل ہو کر میں نے برآمدے کے بڑے بڑے ستون دیکھے اور ۱۸۳۵ء کی وہ رات یاد کی جب پانچ برس کی عمر میں میں نے اپنے باپ کو خدا حافظ کہا تھا۔ صبح کے دو بج رہے تھے جب ۲۰ نومبر ۱۸۴۸ء کو میں اپنے باپ سے ملی۔"

یہ خوب صورت تحریر ایملی (Emily) کی ہے۔ ایملی دلی کے مشہور ریذیڈنٹ (Resident) سر ٹامس مٹکاف (Sir Thomas Metcalfe) کی بڑی بیٹی تھی۔ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئی تھی۔ مگر اس دور کے برطانوی افسروں کی رسم کے مطابق پانچ برس کی عمر میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسے انگلستان بھیج دیا گیا تھا۔ حصولِ تعلیم میں ۱۸۳۵ء سے ۱۸۴۸ء تک کا زمانہ اس نے انگلستان میں گزارا تھا۔ سترہ سال کی عمر میں وہ ہندوستان واپس آئی تھی۔ دو برس کے بعد اس کی شادی دلی کے سینٹ جیمز چرچ (St. James Church) میں فارن ڈی پارٹمنٹ کے انڈر سیکریٹری ایڈورڈ کلائیو بیلی (Edward Clive Bayley) سے ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ایملی، لیڈی کلائیو بیلی (Lady Clive Bayley) کے

Scanned by CamScanner

نام سے مشہور ہوئی۔

ایملی نے اپنے بچپن اور نوجوانی میں ہندوستان کے تہذیبی مرکز دلی میں زندگی بسر کی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب دلی میں مغلوں کی علامتی حکومت اپنے آخری سانس گن رہی تھی مگر اس دور میں انتظامی حالات ٹھیک ہو جانے اور زمینوں کے معاملات درست ہونے کے بعد دلی کی زندگی میں ایک بار پھر ٹھہراؤ اور سکون پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے مقابلے میں کلونیل دلی ایک اطمینان بخش صورت حال میں شب و روز گزار رہی تھی۔ دلی کی پرانی تہذیب گلیوں، دروازوں، حویلیوں، رسوم و رواج، شعر و شاعری، مصوری، خطاطی اور دیگر فنون لطیفہ کے حوالے سے اپنی منفرد شناخت رکھتی تھی۔ دلی کی مشرقی تہذیب پر مقابلے میں برطانوی تہذیب و معاشرت کے ابتدائی نشان بھی نظر آنے لگے تھے۔ ایملی (Emily) نے اس نئی اور پرانی معاشرت کے نقوش کو یادداشتوں کی ایک کتاب میں محفوظ کیا ہے۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے عہد کی دلی کے بارے میں اس کتاب میں نادر یادداشتیں جمع کی گئی ہیں۔ یادداشتوں کے اس مجموعے کا نام، مجموعے کے مرتب اور مالک ٹامس منکاف نے ''بادشاہی دور کی دلی کی یادداشتیں'' (Reminiscences of Imperial Dehli) رکھا تھا مگر اب اسے '' The Golden Calm'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ منکاف (Metcalfe) کے خاندان میں اس مجموعے کو ''دلی بک'' (Dehlie Book) کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔ آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مجموعہ کیا تھا؟ اس کی تاریخ کیا تھی؟ اور یہ مجموعہ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں کس طرح سے تاریخ اور ثقافت کے باذوق قارئین تک پہنچا ہے۔

ٹامس منکاف (Thomas Metcalfe) کمپنی کے ایک نوجوان ملازم کی حیثیت سے دلی آیا تھا اور اس نے اپنی ملازمت کا سارا حصہ دلی اور اس کے نواحی علاقوں میں بسر کیا تھا۔ اس نے اپنا کام اپنے بڑے بھائی چارلس منکاف (Charles Metcalfe) کی نگرانی میں ۱۸۱۳ء میں شروع کیا تھا جو اس وقت دلی کی ریذیڈنسی کا ایک اہم کردار تھا۔ منکاف دلی میں چالیس سال رہا تھا۔ اٹھارہ برس تک وہ گورنر جنرل کلکتہ کا ایجنٹ اور کمشنر رہا تھا۔ وہ بہت شاہ خرچ انسان تھا۔ شاہانہ اطوار سے زندگی بسر کرتا تھا۔ نوجوانی ہی میں وہ مقروض ہو گیا تھا اور اس کے تمام قرضے بڑے بھائی چارلس منکاف نے ادا کر کے اس کو قرض خواہوں سے نجات دلوائی تھی۔ برس ہا برس گزرنے کے بعد چارلس تعجب محسوس کرتا تھا کہ منکاف نے ملازمت میں کچھ بھی نہ بچایا تھا حتیٰ کہ بیس برس کی مدت ملازمت میں اس نے ورثے میں ملنے والے دس ہزار پاؤنڈ کا اثاثہ بھی ختم کر دیا تھا۔ اس کی وجہ اس کی زندگی کا شاہانہ انداز تھا وہ نوادرات کی خریداری کا شائق تھا۔ اس نے دلی سے باہر شاہی طرز کی عمارتیں تعمیر کروائی تھیں اور نوابوں کی طرح ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتا تھا۔

سنہری سکوت (The Golden Calm) کس طرح سے تیار ہوئی تھی یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ دلی میں طویل مدت تک قیام کرنے کے باعث ٹامس منکاف کو اس قدیم تہذیبی شہر کے ماضی اور حال کے ساتھ گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اسے اس شہر کی گلیاں، محلے اور تاریخی عمارات بہت پسند تھیں۔ اس شہر میں مسلسل رہنے سے اسے شہر سے اُنس ہو گیا تھا۔ اپنی چالیس سالہ ملازمت میں شائد ایک بار بھی انگلستان نہ گیا تھا۔ اس لیے اسے دلی شہر کی پرانی عظمت اور تہذیب سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ فنون لطیفہ کا بہت شیدائی تھا اور اس کا اپنا بنایا ہوا گھر منکاف ہاؤس نوادرات کا ایک عجائب گھر تھا جہاں مغرب کی نادر اشیا کا ایک بڑا متاثر کرنے والا ذخیرہ موجود تھا۔ اسے کہیں سے بھی کوئی نادر شے ملتی وہ اسے منکاف ہاؤس کی زینت بنا دیتا تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ سن ستاون سے پہلے کی دلی میں نوادرات کا بہت بڑا ذخیرہ رکھتا تھا۔ دلی کے کسی بھی دیوان میں منکاف ہاؤس سے بڑھ کر مغربی فنون کے اتنے گراں قدر ذخیرے موجود نہ تھے۔

ٹامس منکاف (Thomes Metcalfe) نے دلی سے گہری دلچسپی کے باعث یہاں کے تہذیبی آثار کو محفوظ کرنے کے لیے شہر کی پرانی عمارتوں کی تصاویر بنوانے کا منصوبہ بنایا تھا اس منصوبہ کا مقصد پرانی عمارتوں کے تاریخی کوائف قلم

Scanned by CamScanner

بند کرنا اور ان کی تاریخی اہمیت کو محفوظ کرنا بھی تھا۔ مصوری کے اس شان دار کام کو مکمل کرنے کے لیے مغلیہ دور کی دلی کے معروف مصوروں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہ مصور کون تھے آج ان نام ور فن کاروں کے نام معلوم کرنا بھی مشکل ہے۔ صرف ایک مصور مظہر علی خان کے نام کا پتہ چلتا ہے مگر اسکے بارے میں کوائف موجود نہیں ہے۔ مظہر نے مٹکاف کے منصوبے کے لیے سب سے زیادہ تصاویر تیار کی تھیں۔ اس کے کام، معیار اور تصاویر کی فنی باریکیاں دیکھ کر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مغلیہ منی ایچر (Miniature) کا نام ور فن کار ہوگا۔ گولڈن کام (Golden Calm) میں مصوری کے نمونوں کی تعداد کثیر ہے۔ ان میں سے بیشتر تصاویر پر اس کے دستخط ملتے ہیں۔ مجموعے کی کئی تصاویر ایسی بھی ہیں جن پر کسی کے دستخط نہیں ہیں ان میں سے بھی کچھ تصویریں اس کی مصوری کے اسلوب کے قریب نظر آتی ہیں۔ مغلیہ دور کی عظیم عمارتوں کو باریک نقوش میں مختلق کرنے کے لیے مظہر علی خان نے بڑی عرق ریزی کا ثبوت دیا ہے۔ دیوان خاص اور موتی مسجد جیسی عمارتوں کو منی ایچر میں ڈھالنا بہت مشکل کام تھا۔ مگر یہ سب کچھ اس کی فنی مہارت سے ممکن ہو سکا ہے۔

مٹکاف کے مجموعے کو Reminisiences of Imperical Delhi کا نام دیا گیا تھا۔ مگر مٹکاف خاندان میں اس کو ''دلی بک'' کے نام سے ایڈ کیا جاتا تھا۔ یہ مجموعہ ۱۸۴۴ء میں تیار ہو گیا تھا۔ اس شان دار مجموعے کی تکمیل کے بعد وہ ۱۸۵۳ء میں اچانک بیمار ہوا اور اس دنیا سے گزر گیا۔ اس کے چار برس کے بعد سن ستاون کی بغاوت میں اس کی رہائش گاہ مٹکاف ہاؤس کو کسانوں نے لوٹ کر برباد کر دیا۔ مٹکاف کا یہ شاہ کار اس تباہی میں کیسے محفوظ رہا اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔ انیسویں صدی میں دلی بک مٹکاف خاندان کی زینت بنی رہی۔ خاندان کے ذاتی دوستوں اور رشتہ داروں کے علاوہ بہت ہی کم لوگ اس سے واقف تھے۔ مگر بیسویں صدی کے ربع آخر میں اس مجموعے کی اشاعت ممکن ہو سکی اور تاریخ و تہذیب کے قدر دان اس سے واقف ہو سکے۔ ''دلی بک'' (Delhi Book) کی اشاعت کے پیچھے ایک دل چسپ کہانی موجود ہے۔ ہوا یوں کہ مٹکاف خاندان کا ایک فرد کرنل جان ملڈ مے رکٹس (Colonel John Mildmay Ricketts) تھا۔ ایک بار وہ اپنے خاندان کی بزرگ خاتون لیڈی کلائیو بیلی (دختر ٹامس مٹکاف) کی خدمت میں آداب کہنے کے لیے حاضر ہوا جہاں اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ یہ ۱۹۱۰ء سے پہلے کا زمانہ تھا۔ لیڈی کلائیو بیلی ہندوستان سے ریٹائرمنٹ (۱۸۷۸ء) اور اپنے شوہر کی وفات ۱۸۸۴ء کے بعد اپنے بڑھاپے کے آخری ایام بسر کر رہی تھی (وہ جارج پنجم کے زمانے تک زندہ تھی)۔ کلائیو بیلی کا مہمان اس کا پوتا تھا۔ کرنل جان کو اس کی بیگم نے بتا کر رکھا تھا کہ لیڈی تمبا کو نوشی پسند نہیں خرتی اس لیے اس کے سامنے تمبا کو پینے سے گریز کرے۔ مگر ہوا یوں کہ کلائیو بیلی نے خوش ہو کر نہ صرف خود سگار پیا بلکہ کرنل جان کو بھی پیش کیا۔ دونوں کے درمیان گفت گو کا دل چسپ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ جان اس پذیرائی سے بہت خوش ہوا۔ اس ملاقات کے بعد جلد ہی کرنل جان کو ایک روز خاکی رنگ کا ایک لفافہ موصول ہوا۔ اس نے لفافے کو کھول کر دیکھا تو اندر سے ''دلی بک'' (Delhi Book) برآمد ہوئی۔ یہ وہی نادر مجموعہ تھا جو ایک مدت تک لیڈی کلائیو کی میز کے ایک دراز کی زینت بنا رہا تھا۔ کرنل جان کو یہ مجموعہ اپنے سامنے دیکھ کر جو خوشی ہوئی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اس کے بعد یہ تاریخی شاہ کار ایک طویل مدت کے لیے پھر تنہائی کا شکار ہو گیا۔ ۱۸۴۴ء میں مکمل ہونے والا یہ مجموعہ بالآخر ۱۹۸۰ء میں شائع ہو کر علمی حلقوں میں پہنچا۔ ایم۔ ایم۔ کے (M. M. Kaye) نے اسے مرتب کیا تھا اور ایملی کے یادداشتوں کے ساتھ اپنے شذرات بھی سپردِ قلم کیے تھے۔ اور اب یہ نادر شاہ کار برٹش میوزیم کی زینت ہے۔ ہندستان کی تہذیبی تاریخ کے شائقین اسے بہت ذوق و شوق سے دیکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایملی نے اس مجموعے پر اپنی یادداشتیں بڑھاپے میں قلم بند کروائی تھیں جہاں جہاں پر اس کی یادداشت ٹھیک طور پر کام نہ کر سکی تھی وہاں پر مرتب ایم۔ ایم۔ کے نے اپنی طرف سے نوٹس تحریر کیے ہیں اس طرح یہ کتاب یادگار حیثیت حاصل کر گئی ہے۔

Scanned by CamScanner

ٹامس مٹکاف (Thomas Metcalfe) نے ہندوستان میں اپنی ملازمت کا بیشتر حصہ دلی کے قرب و جوار میں گزارا تھا اور دلی ہی میں اس نے اپنی رہائش گاہ تعمیر کرنے کے لیے جمنا کے قریب ایک ہزار ایکڑ سے زیادہ زمین خریدی تھی اور اسی زمین پر اس نے مٹکاف ہاؤس (Metcalfe House) کے نام سے ایک شان دار عمارت تعمیر کروائی تھی۔ جو دلی میں برطانوی طرزِ تعمیر کے ابتدائی نمونوں میں تھی۔ اس عمارت کی کہانی سناتے ہوئے ایملی (Emily) کہتی ہے کہ یہ عالی شان ستونوں والی محل نما عمارت تھی۔ یہ عمارت درختوں، مصنوعی جھیلوں اور خوب صورتی سے ترتیب دیے گئے باغات سے گھری ہوئی تھی۔ مٹکاف نوادرات کا بے حد شائق تھا اور اس کے اس گھر میں نوادرات کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ ایملی اور اس کی بہن اپنے بچپن کے ایام میں جمنا کے کنارے اپنی آیا کے ساتھ جایا کرتی تھیں اور وہاں روپہلی ریت میں کھیلتی تھیں۔ جمنا کے کنارے ان دنوں پرندوں سے آباد ہوتے تھے۔ وہاں پر وہ فاختائیں، ست بے، کوئلیں، مور، چھوٹے طوطے، سفید بگلے اور نیل کنٹھوں کی پروازیں دیکھا کرتے تھے۔ اور ان پرندوں کی چہکاروں سے شاد ہوا کرتے تھے۔

مٹکاف ہاؤس کے اطراف میں ایک شان دار برآمدہ ہوتا تھا۔ چوبیس سے تیس فٹ تک چوڑا اور بہت بلند و بالا تھا۔ مٹکاف ہاؤس کی عمارت عظیم الشان ستونوں پر کھڑی تھی۔ یہ ایک عالی شان گھر تھا کہ جس کے اندر ہر شے حقیقی طور پر خوب صورت تھی۔ ہندوستان میں نو وارد گان کو اس گھر کا فرنیچر بھاری اور پرانے فیشن کا لگتا تھا مگر اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ مہاگن، روز وڈ اور سنگ مرمر سے بنا یہ فرنیچر اس زمانے کے فیشن کا اسلوب تھا۔ بہت سیمیز یں مکمل طور پر صرف سنگ مرمر کی تھیں۔ ان کے بالائی حصے، پائے اور باقی سب کچھ سنگ مرمر ہی کا تھا۔ مختلف کمروں میں موجود کتابوں کی خوب صورتی سے جلد بندی کی گئی تھی اور جو کتابیں ایملی کے باپ کے کمرے میں تھیں ان کی جلد بندی کے لیے روسی چمڑے کا استعمال کیا گیا تھا۔ وہ سال میں دو بار انگلستان سے کتابوں کا بڑا ڈبہ منگواتا تھا۔ ہندوستان میں ملازمت کے چالیس سال کے دوران میں اس کے کتب خانے میں بیس ہزار سے زیادہ کتب جمع ہو گئی تھیں۔ اور یہ سب کتابیں سن ستاون میں غدر کے دوران میں تباہ ہو گئی تھیں۔

مٹکاف ہاؤس کے کمرے بڑے اور بلند تھے اور یہ سب کمرے چوبیس فٹ بلند تھے۔ مطالعہ کا کمرہ، کتب خانہ اور نپولین گیلری ایک ہی رو میں تھے۔ ڈرائنگ روم اور کمرۂ ضیافت ان کے عقب میں تھے اور ان کا رخ مشرق اور مغرب کو تھا۔ اس کے بعد ڈے روم (Day Room) اور چھوٹا ڈرائنگ روم اور کمرۂ طعام تھا۔ یہ کمرے چھوٹے کلیسا (Oratory) اور پیش گاہ (Lobby) کی طرف کھلتے تھے۔ ایملی ان دنوں کی پاگل کر دینے والی مسرتوں کو ایذ کرتی ہے۔ ان ایام کا ہر تجربہ نیا اور خوش کن تھا۔ گھر کے ہر کمرے میں دیکھنے کے لیے بہت کچھ موجود تھا۔ خوب صورت تصاویر، فرنیچر، کتابیں اور زیورات۔ میرا سارا دن ان اشیا کی تعریف و تحسین میں گزر جاتا تھا اور یہ سب کچھ مرے لیے بہت نیا تھا۔

مٹکاف ہاؤس کے ایک خاص کمرے کا نام ''نپولین گیلری'' تھا۔ میرا باپ نپولین کا شیدا تھا۔ نپولین گیلری مٹکاف ہاؤس کے شمال مشرقی کونے میں تھی اور یہ کمرہ نپولین کی یاد میں وقف کیا گیا تھا۔ نپولین گیلری میں کتابوں کے شیلف نپولین پر ملنے والی بہترین اور ازبس دل چسپ کتب سے بھرے ہوئے تھے اور ان کے موضوعات نپولین کی زندگی اور کارناموں پر مشتمل تھے۔ دیواریں نفیس engravings سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ یہاں اس ہیرو کی بڑی بڑی تصویریں تھیں۔ اس کے جرنیلوں اور واقعات پر مبنی تصاویر بھی لٹک رہی تھیں۔ کمرے کے ایک کونے میں سنگ مرمر کے ایک پیڈسٹل پر کینووا (Canova) کے بنائے نپولین کے بالائی جسم کا ایک مجسمہ تھا جو فن کا ایک عمدہ نمونہ تھا۔ یہ نمونہ بھی سن ستاون میں تباہ ہو گیا تھا۔ ایملی افسوس سے کہتی ہے کہ اب اس کے پاس اس مجسمے کے صرف چند ٹکڑے رہ گئے تھے جو اس نے مٹکاف ہاؤس کی تباہی کے بعد تباہ شدہ آثار سے اٹھائے تھے۔

Scanned by CamScanner

نپولین گیلری کی مرکزی اور پہلو میں رکھی جانے والی میزیں کانسی کے اور دیگر مجسموں سے آباد تھیں اور ان سب کا تعلق نپولین کی زندگی سے تھا۔ کانسی کا ایک خاص عمدہ مجسمہ تین فٹ لمبا تھا، یہ لودی پل (Lodi Bridge) کی جنگ کو پیش کر رہا تھا۔ مگر یہ اور دیگر فن پارے سن ستاون کے مئی کے وسط میں مٹکاف ہاؤس سے لوٹ لیے گئے تھے۔ مرکز کی میز پر شیشے کے ایک ڈھانچے میں سنگ مرمر کا ایک خوب صورت سٹینڈ تھا جس پر نپولین کا چاندی کا مجسمہ تھا۔ اس مجسمے کے نیچے نپولین کے جواہرات تھے۔ یہ مرے پاس ہیں۔ ایک فوجی نشان اور ایک ہیرے کی انگوٹھی بھی تھی جس پر نپولین کے initial تھے۔ یہ سامان مرے باپ نے ولیم فریزر کی موت کے بعد خریدا تھا۔ فوجی نشان اور انگوٹھی سن ستاون کی لوٹ میں برباد ہوئے مگر نپولین کے جواہر ۱۸۵۴ء میں لندن لیتی آئی تھی۔ اس لیے یہ محفوظ رہے۔

ٹامس مٹکاف (THomas Metcalfe) ۱۸۳۵ء سے ۱۸۵۳ء تک دلی کا ریذیڈنٹ رہا تھا۔ آیئے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ریزیڈنٹ کیا ہوتا تھا اور دفتری نظام میں اس کی کیا حیثیت ہوتی تھی اور سیاسی طور پر وہ کیا کردار ادا کرتا تھا۔

''دلی میں ریذیڈنٹ کا کام صرف شہنشاہ کی ذات ہی سے وابستہ نہ تھا۔ دلی کے ریذیڈنٹ کی حیثیت سے وہ دلی کے نواحی معاملات کا بھی نگران تھا اور دلی سے دور راجپوتانہ، ملتان، پنجاب اور بہاولپور اور بہاولپور سے بھی آگے کابل تک کے سیاسی معاملات کی نگرانی اس کے سپرد تھی۔ اسی طرح اعلیٰ سطح پر منظم سراغ رسانی کا محکمہ اور تربیت یافتہ منشیوں کا عملہ موجود تھا۔ اس اعلیٰ ڈھانچے کی بہ دولت ریذیڈنٹ کسی بھی علاقے یا کسی خاص فرد کے بارے میں حکمت عملی بنانے میں مکمل طور پر تیار رہتا تھا۔

راجپوتانہ اور پنجاب کی ریاستوں کے آنے والے وکیلوں کے منظر سے دلی کی ریذیڈنسی زمانہ وسطی کے ہندوستانی دربار کا نمونہ پیش کرتی تھی۔ آکٹرلونی (Ochterlony) اور فریزر (Fraser) جیسے ریذیڈنٹ جو مزاج کے اعتبار سے نیم ایشیائی ہو چکے تھے، اپنے درباروں کا طمطراق اور رونق پسند کرتے تھے۔

ریذیڈنٹ کا تقرر کلکتہ میں کمپنی کا گورنر جنرل کرتا تھا اور ریذیڈنٹ گورنر جنرل کے سامنے اپنے فرائض کی بجا آوری میں جواب دہ تھا۔ گورنر جنرل اس کی کارکردگی کا نگران تھا۔ کمپنی کی حکمت عملی کے مطابق وہ ریذیڈنٹ کو موقع بہ موقع ہدایات جاری کرتا تھا۔ گورنر جنرل جب کسی ریاست کے حکمران کے حقوق آہستہ آہستہ سلب کرنے کا فیصلہ کرتا تھا تو یہ کام تدریجی طور پر ریذیڈنٹ ہی سرانجام دیتا تھا۔ ریاستوں کے اندر ہر قسم کے سازشی ماحول کو پیدا کرنے کا کام بھی ریذیڈنٹ ہی کے سپرد تھا اور وہی ان ریاستوں کی حیثیت کم زور کرنے کے بعد کمپنی کے لیے مراعات حاصل کرتا تھا۔ دلی کے زیذیڈنٹ کو اپنے طور پر بھی فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ انیسویں صدی کے نصف اول تک چونکہ دلی اور کلکتہ کے درمیان کئی مہینوں کا فاصلہ حائل تھا، اس لیے کلکتہ سے کسی مسئلہ پر ہدایات حاصل کرنے میں لمبی مدت لگ جاتی تھی۔ دریں حالات دلی کا ریذیڈنٹ کسی مسئلہ پر خود فیصلہ کرتا اور منظور کے لیے گورنر جنرل کے پاس کلکتہ ارسال کر دیتا تھا، جہاں پہ اس کے فیصلوں کی بالعموم توثیق ہو جاتی تھی اور اختلاف کی صورت میں اسے تنبیہ بھی کر دی جاتی تھی۔ ریذیڈنٹ چونکہ بہت تجربہ کار لوگ ہوتے تھے اور کمپنی کی حکمت عملیوں پر عبور رکھتے تھے، اس لیے اختلافات کے مواقع کم کم ہی پیدا ہوتے تھے۔

۱۹ویں صدی کے شمالی ہند میں مرکز سیاست دلی کی ریذیڈنسی تھی۔ ہندوستان کے مختلف درباروں میں تعینات کیے گئے برطانوی افسر، گورنر جنرل اور ریاستوں کے درمیان محض رابطہ کا ایک ذریعہ ہی نہ تھے بلکہ اس سے کہیں زیادہ یہ وہ نمائندہ سفارت کار تھے جو نہ صرف ابتدائی معلومات فراہم کرتے تھے بلکہ حکومت کی حکمت عملی کا نفاذ بھی کرتے تھے۔ یہ ہندوستانی ریاستوں میں جاسوسی کا عمدہ نظام قائم کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے محلات کے اندر جاسوس مقرر کیے جاتے تھے جو روزانہ

Scanned by CamScanner

اپنے اپنے آقاؤں کی سرگرمیوں سے آگاہ کرتے تھے۔ ان جاسوسوں کی نگاہ سے کوئی شے چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ حتیٰ کہ شہزادوں کی ذاتی زندگی کے معمولی واقعات بھی۔ ان ہی ذرائع سے کمپنی اپنا اثر برقرار رکھتی تھی اور اپنے مفادات کے خلاف ہونے والی سازشوں کا مقابلہ کرتی تھی اور بقول ٹامس منرو (Thomas Munro) ان ہی اداروں کے ذریعے گورنر جنرل ہندوستان کے ہر دربار میں غائبانہ طور پر موجود رہتا تھا۔''(1)

ٹامس مٹکاف ایک نہایت سلجھا ہوا تجربہ کار و ذی فہم شخص تھا۔ دلی بک میں ایملی (Emli) نے اپنے باپ کی روزمرہ زندگی اور عادات کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ کمپنی کے دور کے برطانوی افسروں کی زندگی کا ایک نمونہ ہے۔ وسیع وسائل، اختیارات، بڑی تنخواہیں اور سہولتیں، برطانوی افسروں کی زندگی کو ہندوستانی نوابوں کے برعکس اس کی زندگی اپنے خاص قاعدے، آداب اور اصولوں کے مطابق گزرتی تھی جہاں ہر شے کے لیے ایک وقت مقرر تھا۔ اس کے اوقات گھڑی کی سوئیوں کی طرح حرکت کرتے تھے۔ وقت پر سونا، وقت پر جاگنا، وقت پر کھانا، اس کی زندگی کے آداب کا حصہ تھا۔ تفریح کے لیے بھی وقت مقرر تھا۔ وہ زندگی میں ڈسپلن کا بڑا قائل تھا اور دوسروں سے توقع رکھتا تھا کہ وہ ڈسپلن کی پابندی کریں گے۔

ایملی (Emily) اپنے باپ کے حلیے کے بارے میں لکھتی ہے کہ میرا باپ دراز قد انسان نہیں تھا۔ وہ مضبوط بدن رکھتا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں چھوٹے اور خوب صورت تھے۔ ناک ستواں تھا۔ بال بھورے تھے۔ سر پر گنج تھا۔ آنکھیں نیلی تھیں۔ بچپن سے چہرے پر چیچک کا نشان تھا اس لیے اسے خوب صورت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کی آواز بہت خوش گوار تھی۔ وہ مکمل طور پر ایک شریف النفس آدمی تھا۔ اپنی عادات کے اعتبار سے اور ظاہری طور پر وہ صاف ستھرا شخص تھا۔ اس کے کپڑے لندن میں ایک اول درجے کا درزی تیار کرتا تھا اور یہ بہت اعلیٰ ہوتے تھے۔ اسک ے جوتے اور دستانے بھی بہترین قسم کے ہوتے تھے۔ اس کی ہر شے اس کے ذوق کا اظہار کرتی تھی۔

مٹکاف کی خواب گاہ ایملی کی نشست گاہ کے ساتھ تھی۔ معمول کے مطابق ہر صبح وہ پانچ بجے بیدار ہو جاتا تھا۔ اپنا گاؤن پہن کر وہ برآمدے میں آ جاتا تھا جہاں وہ ''چھوٹا حاضری'' (Small Breakfast) طلب کرتا تھا۔ وہ برآمدے میں سیر کرتا رہتا تھا اور اسی جگہ اس کے ملازمین حاضر ہو کر اس سے نئے دن کے احکامات لیتے تھے۔ سات بجے وہ کونے کے نیچے برآمدے کے بنے ہوئے تالاب میں تیرتا تھا۔ اس کے بعد لباس پہن کر اور مذہبی عبادت سے فارغ ہو کر وہ باقاعدگی کے ساتھ آٹھ بجے ناشتے کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔ ہر شے کے لیے ازبس باقاعدگی کے ساتھ حکم دیا جاتا تھا اور تمام گھریلو انتظامات پر گھڑی کی سوئیوں کی طرح عمل ہوتا تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد اس کا حقہ لایا جاتا اور اس کی کرسی کے عقب میں ایک قالین پر رکھ دیا جاتا تھا۔ حقے کا پیندہ خالص چاندی کا تھا اس کا قطر (Diameter) اٹھارہ انچ تھا۔ حقے کی خوش گوار تمباکو والی چلم پر چاندی کا خوب صورت کام تھا اور اس کے ساتھ چاندی ہی کی زنجیر لٹکتی رہتی تھی۔ سانپ جیسی حقے کی نے تقریباً چھ سے آٹھ فٹ لمبی تھی۔ وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک تمباکو نوشی کرتا تھا۔ ایملی کہتی ہے کہ حقہ کے کش کی آوازیں اب تک اس کے کان میں سنائی دیتی ہیں۔

ایملی (Emily) کے بقول حقہ نوشی سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرۂ مطالعہ میں جا کر بالعموم خطوط لکھتا تھا۔ دس بجے اس کی گاڑی پابندی کے ساتھ پیش دالان میں پہنچ جاتی تھی۔ وہ نوکروں کی ایک قطار عبور کر کے وہاں تک جاتا تھا۔ ایک نوکر کے ہاتھ میں اس کا ہیٹ ہوتا تھا۔ دوسرے کے ہاتھ میں دستانے، ایک اور کے پاس رومال، اگلے والے کے ہاتھ میں سونے کے دستے والی چھڑی، ایک اور کے ہاتھ میں ڈاک کا ڈبہ یہ چیزیں گاڑی میں رکھوا دی جاتی تھیں۔ جمعدار کوچوان کے پیچھے بیٹھتا تھا اور دو سائیس گاڑی کے پیچھے کھڑے رہتے تھے۔ اس کے پاس گاڑی کے لیے گھوڑوں کے دو جوڑے ہوتے تھے۔ ان میں ایک جوڑا دن کے دوران اور دوسرا شام کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

Scanned by CamScanner

ٹامس مٹکاف ہر روز دفتر سے ڈھائی بجے لوٹتا تھا۔ معمول کے مطابق تین بجے کھانا کھاتا تھا۔ شام کے لیے وہ بہت ہلکا کھانا کھاتا تھا۔ یہ اس کا دستور تھا کہ رات آٹھ بجے وہ کھانے کے کمرے سے اپنی خواب گاہ میں جانے کے لیے نکل آتا تھا۔ اس وقت آرام کرنے کے لیے بندوق کا فائر ہوتا اور گھڑی ٹھیک آٹھ بجاتی تھی۔ اس وقت سے پہلے ہی وہ حقہ نوشی ختم کر کے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ میز پر بیٹھے افراد کو خدا حافظ کہتا۔ گلے میں کھانے کے لیے بندھا کپڑا اتار کر فرش پر گرا دیتا۔ پھر وہ اپنے ڈرائنگ روم میں پردے کے پیچھے غائب ہو جاتا تھا۔

اس کے معمولات کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر نپولین گیلری میں اپنے آپ کو تر و تازہ کرنے کے لیے بیٹھتا تھا۔ یہاں سے وہ بلیرڈ کھیلنے کے لیے تہ خانے میں جاتا تھا۔ بلیرڈ اس کے لیے صرف تفریح ہی نہ تھی بلکہ اس کے لیے یہ ضروری ورزش بھی تھی۔ بلیرڈ کھیل کر وہ سیدھا گھر کے چبوترے کی طرف جاتا تھا۔ جہاں تین چار کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ یہاں وہ کچھ گھنٹوں کے لیے بیٹھا کرتا تھا۔ اس جگہ وہ رات کے کھانے کے وقت تک موجود رہتا اور یہ معمول تھا کہ اس وقت دوست اس سے ملاقات کے لیے چبوترے پر آیا کرتے تھے۔

عورتوں کے بارے میں مٹکاف کی بعض باتیں بہت عجیب تھیں۔ وہ عورتوں کو پنیر یا نارنگیاں کھاتے یا آم چوستے ہوئے نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کام غسل خانے کی خاموشی میں ہونا چاہیے۔ اس لیے ایملی کہتی ہے کہ نارنگیاں کھانے کے لیے میں اکثر اپنے پھوپھا کرنل رچرڈ لارنس کے ساتھ قطب مینار کی بالائی منزل میں جایا کرتی تھی۔ وہاں ہم سکون سے نارنگیاں کھا سکتے تھے۔

گرمی کا موسم آتا تو دلی کے در و دیوار موسم کی شدت سے جھلس جاتے تھے۔ انسان بری طرح بے حال ہو جاتے تھے۔ یورپین لوگ اس موسم کی شدت کو اور بھی زیادہ محسوس کرتے تھے۔ ایملی (Emily) اپنی یادداشتوں میں ان ایام کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ کہتی ہے کہ مئی کے مہینے میں دلی میں گرمی اتنی شدت پکڑ لیتی تھی۔ ہم لوگ سیر کے لیے بھی رات نو بجے یا صبح تین بجے نکلا کرتے تھے۔ میں اکثر سیر کے لیے صبح سویرے جایا کرتی تھی۔ دن بھر کی گرمی سے تھک ہار کر میں اپنے باپ کی طرح رات آٹھ بجے سو جایا کرتی تھی۔ اس گرمی کا علاج خس کی ٹٹیاں ہوتی تھیں یا چھت سے لٹکتے ہوئے کپڑے کے پنکھے۔ گھر کے ہر کمرے میں یہ پنکھے لگے ہوئے تھے۔ گھر کے اندر رہتے ہوئے ایملی دن بھر مطالعۂ کتب میں مصروف رہتی یا موسیقی کے آلات سے دل بہلاتی رہتی تھی۔ مگر جب وہ طویل مدت کے بعد ۱۸۴۸ء میں ہندوستان کو لوٹی تھی تو اس برس کی پہلی گرمیاں اس کے لیے از بس گرم تھیں۔ خود مٹکاف بھی یہ کہتا تھا کہ اس نے ایسی گرمی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس لیے ایملی نے اس برس کی گرمی کو خوفناک طور پر محسوس کیا تھا۔ مگر اس کے گھر کو خس اور پنکھے سکون بخشتے تھے۔ جب سندھ کے ریگستانوں کی لو دلی میں پہنچتی تو خس کی ٹٹیاں اس کا مقابلہ کرتیں۔ مگر گرمی کا مقابلہ کرنے کے لیے یورپین لوگوں نے ایک گرمی توڑ (Thermantidot) بھی ایجاد کر رکھا تھا۔ یہ گرمی توڑ لکڑی کا ایک ڈبہ ہوتا تھا جو تین اطراف سے بند ہوتا تھا۔ سامنے والی طرف کھلی رکھی جاتی تھی اس میں خس نصب کر دی جاتی تھی۔ ڈبہ کے اندر ایک پہیہ ہوتا تھا جو ایک لمبے ہینڈل سے پیوست ہوتا تھا۔ اس ہینڈل کو ایک قلی زور سے چلاتا تھا جس سے ہوا پیدا ہو کر گھر کو ٹھنڈا کرتی تھی۔ گرمی توڑ کی خس پر مسلسل پانی ڈالا جاتا تھا۔ ایسے شدید موسم میں ایملی گرمی توڑ کے نزدیک ہو کر بیٹھتی تھی اور گرمی سے اکتائے ہوئے جسم کو سکون دیتی تھی۔ ٹامس مٹکاف (Thomas Metcalfe) نے دلی سے ذرا ہٹ کر قطب کے پرفضا مقام پر ایک اور عمارت تعمیر کی تھی جس کا نام "دل کشا" رکھا گیا تھا۔ اسے اپنے دفتری امور سے جب بھی فرصت ملتی تو وہ چند دنوں کے لیے اپنے اس تفریحی مرکز کا رخ کرتا تھا۔ ایملی لکھتی ہے یہ بہت مسرور کن غیر معمولی جگہ تھی۔ یہ ہشت نما قسم کی عمارت کئی کمروں پر مشتمل تھی۔ عمارت کے گرد اس کے باپ نے ایک بہت دل کش باغ لگایا تھا۔ اور باغ میں مہمانوں کی رہائش کے لیے تین چار کمرے تعمیر کروائے تھے۔

Scanned by CamScanner

ماحول کی لطافت کے سبب عام طور پر نئے شادی شدہ جوڑے مرے باپ سے اجازت لے کر یہاں ہنی مون کے لیے قیام کیا کرتے تھے۔ قطب مینار کی قربت کی وجہ سے یہ مقام بہت پیارا معلوم ہوتا تھا۔ قطب مینار کے قرب و جوار کی زمین پتھریلی تھی۔ اس نے اس زمین پر کچھ فاصلے پہ ایک مینارۂ نور (Light House) اور ایک .....نما عمارت بھی تعمیر کروائی تھی اور عمارت کے ایک کنگرے دار دیوار بھی تھی۔ جب کبھی ہم دلکشا میں قیام کرتے تھے تو میرا باپ یہاں روشنی کرتا تھا۔ ایملی ایک دل چسپ واقعہ بھی سناتی ہے کہ ان باتوں کے گزرنے کے پچاس برس بعد لندن کی بانڈ سٹریٹ میں اس نے اس قلعہ نما عمارت کی ایک واٹر ہر پینٹنگ دیکھی تھی جس کا عنوان تھا "The Metcalfe Battery" اس مقام پر مٹکاف نے حسب عادت یہاں ایک اچھا کتب خانہ، کثیر مقدار میں عمدہ Engravings اور خوب صورت زیورات جمع کر رکھے تھے اس لیے یہ ایک بہت پُر ذوق مسکن بن گیا تھا اور میں اس سے بہت محبت کرتی تھی۔

ایملی نے انیسویں صدی میں دلی کی یورپین سوسائٹی کا تعارف بہت دل چسپ انداز سے کرایا ہے۔ اس دور میں دلی کی یورپین سوسائٹی مختلف قسم کے لوگوں اور طبقوں پر مشتمل تھی۔ اس میں پہلا طبقہ اعلیٰ درجے کے سرکاری افسروں کا تھا۔ یہ محدود اور منتخب لوگوں کا طبقہ تھا جس میں فوجی افسر بھی شامل تھے۔ اس میں دو قسم کے فوجی افسر ملتے تھے۔ اول وہ افسر تھے جو کمپنی کے باقاعدہ ملازم تھے اور دوم وہ جو کمپنی کی فوج میں باقاعدہ یا بے قاعدہ صیغہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یورپین سوسائٹی میں دکان دار بھی تھے اور بنک کے ملازم بھی۔ دلی کی اس سوسائٹی میں جراحوں اور معالجوں کا طبقہ بھی شامل تھا۔ اس طبقہ کا نمائندہ فرد ڈاکٹر لڈلو (Dr. Ludlow) تھا جو اس معاشرت کا مشہور کردار تھا۔ یہاں کچھ صحافی بھی تھے جو "دلی گزٹ" چلاتے تھے۔ برطانوی لوگوں کے ساتھ یہاں فرانسیسی، پرتیگز اور جرمن بھی تھے۔ ان میں سے کچھ مغلیہ دور سے آباد تھے جیسے ڈرماؤ خاندان (Dermao Family)۔ کچھ لوگ خانہ جنگی کے دور کے مہم جو تھے ان میں بیگم سمرو کا خاندان والٹر رین ہارڈٹ (Walter Reinhordt) تھا۔ جیمس سکنر (James Skinner) جیسے افراد تھے جو دوسری مرہٹہ جنگ کے وقت انگریزوں سے آ ملے تھے۔

ایملی (Emily) نے اپنی یادداشتوں میں دلی کی یورپین سوسائٹی کے بعض دیگر افراد کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے باپ نے اسے مسز جان گبن (Mrs. John Gubbin) سے ملوایا تھا جو چرچ کے پاس ایک خوبصورت گھر میں رہتی تھی۔ مسٹر گبن چھوٹے قد اور سانولے رنگ کا انسان تھا جو دلی کا ایک جج تھا۔ ایملی کی ایک ملاقات مس رابرٹ سنز سے بھی ہوئی تھی جو لال قلعہ میں برطانوی نمائندہ تھا اور ٹامس مٹکاف کا معاون تھا اس کی رہائش قلعہ کے مرکزی دروازے کی بالائی منزل پر تھی۔ دلی کا مشنری ڈیوڈ تھامپسن (Reverend David Thompson) بھی مٹکاف فیملی کا رفیق تھا۔ مٹکاف اس کی بہت عزت و تعظیم کرتا تھا۔ ایک بار جب ایملی باپ کے ساتھ اسے ملنے گئی تو وہ شام کے لباس میں تھا وہ کالے رنگ کا ہیٹ اور دستانے پہنے ہوئے تھے۔ وہ خود اور اس کا خاندان گہرے سانولے رنگ کے افراد تھے۔ ان کی رگوں میں کثرت سے مقامی خون تھا۔ اور اس وجہ سے وہ لباس سے متعلق انگلش آداب سے بالکل ناواقف تھے۔ ایملی نے کئی لوگوں کا ذکر کیا ہے ان میں ڈاکٹر راس (Rass) بھی تھا۔ وہ کہتی ہے راس (Rass) بدشکل آدمی تھا۔ وہ بہت برا ڈاکٹر تھا۔ ایک بار اس نے اپنی تند ادویات سے مجھے تقریباً مردہ کر دیا تھا۔

دلی کی یورپین اور یوریشین (Euration) سوسائٹی میں سے ایملی نے دو ایسے لوگوں کا ذکر بطور خاص کیا ہے جو اس زمانے میں دلی کی نئی سوسائٹی میں بہت شہرت رکھتے تھے۔ پہلا شخص کرنل جیمز سکنر (Col. James Skinner) تھا اور دوسری شخصیت ایک عورت کی تھی اور وہ تھی بیگم سمرو (Begum Sombre)۔ دلی کے سینٹ جیمز چرچ کے سامنے ایک محل نما عمارت تھی جو سکنر ہاؤس (Skinners' House) کہلاتی تھی۔ اس عمارت کے قرب میں ایک مسجد بھی تھی جسے کرنل

Scanned by CamScanner

سکنر نے اپنے مسلمان دوستوں کے لیے تعمیر کروایا تھا۔ وہ سانولے رنگ کی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی بیوی ایک مقامی عورت تھی۔ اس کے تمام بچوں کے رنگ بھی بہت سانولے تھے۔ وہ سب غیر معمولی لہجہ میں انگلش بولتے تھے۔ یہ خاندان دلی میں ایک ممتاز حیثیت کا حامل تھا۔ ایملی کہتی ہے کہ میرا باپ کرنل سکنر کا ایک گرم جوش دل رکھنے والا انسان اور ایک عمدہ سپاہی کی حیثیت سے بہت احترام کرتا تھا۔ اس کا ایک بیٹا جوئے سکنر (Joe Skinner) تھا۔ وہ عجیب چیز تھا۔ کسی ملاقات پر جانے کے لیے وہ سبز رنگ کا کوٹ پہنچتا تھا جو کمر کے نیچے سے دولخت ہوتا تھا، جس پر ملمع شدہ یا سونے کے بٹن لگے ہوتے تھے۔ بہت ہلکی سرخی مائل گہرے اودے رنگ کی پتلون، چمڑے کے جوتے، سونے کے بٹنوں والی سفید واسکٹ اور ایک سفید نکٹائی۔ اس کے ساتھ ہمیشہ سونے سے مڑی ہوئی بھورے رنگ کی ملاکا (ملائشیا) چھڑی ہوتی تھی۔ کرنل سکنر کا ایک اور بیٹا بھی تھا جس کا نام الیک سکنر (Aleck Skinner) تھا۔ ایک دن ایملی کو اس نے پیانو پر ایک انگلش گیت سنایا تھا۔ گیت کے لفظ اور اس کی دھن اسے بالکل سمجھ نہ آ سکی تھی مگر جب اس نے گیت کا متن دیکھا تو معلوم ہوا یہ Villikins and Dinah کا گیت تھا۔ وہ دونوں اپنے وقت کے پریمی تھے مگر Dinah کے سنگ دل باپ نے شادی کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جس پر دونوں پریمی...... پر...... کر مر گئے تھے۔ یہ گیت ایملی کے باپ کو بھی بہت پسند تھا۔

بیگم سمرو (Begum Sombre) کے بارے میں ایملی یہ لکھتی ہے کہ بیگم ایک داستانی کردار کی عورت تھی۔ وہ ہندوستان کی جنگ جو شہزادی تھی۔ وہ ایک دولت مند جرمن جنگ جو والٹر رین ہارڈت (Walter Reinhardt) کی دوسری بیوی تھی۔ والٹر کرائے کے سپاہیوں کی فوج کا جنرل بن گیا تھا۔ وہ سمرو (Sumroo) کے نام سے جانا جاتا تھا۔ والٹر کا رنگ سانولہ تھا اسی مناسبت سے اس کے یورپین دوستوں نے اس کا عرف Le Sombre سے سمرو بنا دیا تھا۔ اس کی موت کے بعد بیگم نے عیسائیت اختیار کر لی تھی اور اپنے خاوند کے لشکر کی سردار بن گئی تھی۔ دلی میں اس کی عالی شان کوٹھی بہت مشہور تھی۔

''گولڈن کام'' (Golden Calm) میں یورپین تہذیب و معاشرت کے جو نمونے ملتے ہیں وہ ۱۸۰۳ء میں فتح دلی کے بعد وہاں کی زمین پر آہستہ آہستہ نمودار ہوئے تھے۔ تقریباً نصف صدی کے عرصے میں مغلیہ تمدن کے مقابلے میں برطانوی تمدن کے منفرد نمونے اپنی شان و شوکت کے ساتھ نظر آنے لگے تھے۔

''دلی اور اس کے گرد و نواح میں جہاں تہذیب و تمدن پر قدامت کا رنگ غالب تھا، وہاں انگریزوں کی آمد ۱۸۰۴ء اور ریذیڈنسی کے قیام کے بعد رفتہ رفتہ مغربی تہذیب و تمدن کے آثار بھی ظاہر ہونے لگے تھے۔ اس نئی زندگی کو غالب نے دلی کے نواح میں بذات خود ابھرتے ہوئے دیکھا تھا۔ مغلوں کی عظمت رفتہ کے ساتھ ایک نو آبادیاتی طاقت اپنی تہذیب کا مظاہرہ شروع کر چکی تھی۔ آغاز میں فصیل شہر کے ساتھ کشمیری دروازے کے قریب مغربی طور کے مکانات تعمیر ہوئے۔ بعد میں وہ شہر کے جنوبی حصے سے شمالی جانب پہاڑی (Ridges) تک بھی تعمیر ہوتے چلے گئے تھے۔

فوجی اور سول افسروں نے محدود سطح پر اپنے لیے ایک ننھی سی میٹروپولیٹن (Metropolitan) زندگی تخلیق کر لی تھی۔ وہ اپنی الگ سے بسائی ہوئی اس مختصر سی دنیا میں رہتے تھے۔ دلی کا ریذیڈنٹ اس چھوٹی سی دنیا کا مرکز تھا۔ لڈلو کیسل (Ludlow Castle) برطانوی افسروں کی اس دنیا کا بکنگھم پیلس (Buckingham Palace) تھا۔ مٹکاف ہاؤس (Metcalfe House) کی حیثیت ونڈسر (Windsor) کی تھی۔ مہرولی کا دل کشا، سینڈرنگھم (Sandringham) تھا اور کشمیری دروازے کا سینٹ جیمز چرچ (Saint James Church) اس چھوٹی سی دنیا کا کیتھڈرل (Catherdral) تھا۔

لال قلعہ کے شاہی محل کی دیوار سے باہر جنوبی سمت میں انگریز افسران کے لیے دلی کلب قائم ہو چکا تھا۔ جہاں سر شام

Scanned by CamScanner

محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔ ایسی محفلوں کے لیے ''پنچ'' (Puch) ایک پسندیدہ مشروب سمجھا جاتا تھا۔ اس مشروب کا اہم جزو ''عرق'' کہلاتا تھا۔ جو مقامی طور پر ببول، چاول یا تاڑی سے بنائی جانے والی شراب تھی جس میں نشہ کی مقدار دگنی یا تگنی ہوتی تھی۔ ''گوا'' (Goa) کا ''عرق'' مشہور تھا۔ اس میں عرق گلاب، لیموں کا رس، شکر اور پانی کی آمیزش کی جاتی تھی اور یہ مجموعہ ''پنچ'' کے نام سے مشہور تھا۔ دلی کے شراب فروشوں کی دکانیں فرانسیسی، پرتگالی اور سکاچ مشروبات سے بھری رہتی تھیں۔ کناری (Canary)، برانڈی (Brandy)، ایل (Ale)، ریڈ اور وائٹ وائن (Red and White Wine)، بیر (Bear)، مدیرا (Maderia)، عرق اور وسکی (Whisky) اس دور کی مشہور شرابیں تھیں۔ (۲)

برطانوی افسروں کی دنیا بہت محدود تھی۔ برطانوی معاشرت اور تمدن کی یہ دنیا اس دور میں بہت مختصر تھی۔ ان کی آبادی کشمیری دروازے بے باہر باڑہ ہندورا ؤ اور پہاڑی کے علاقے میں تھی۔ دلی کے تنگ مکانوں میں گرمی کے ایام میں رہنا ان کے لیے بہت مشکل تھا۔ ایسے مکانوں میں ان کے سانس گھٹتے تھے اور وہ ان کو قید خانہ تصور کرتے تھے۔ اس لیے وہ شہر سے باہر کھلے مکانوں میں رہنے لگے تھے۔ ایک طرف یورپین آبادکاروں کی نئی سوسائٹی تھی اور دوسری طرف دی شہر بدستور فصیل شہر کے اندر آباد تھا۔ لوگ اپنے تنگ گھروں اور گلی کوچوں سے محبت کرتے تھے۔ دلی شہر اپنی تہذیب پر نازاں تھا۔ یہاں کے شہری مغربی تہذیب و ثقافت سے بے نیاز فصیل شہر کے اندر روایتی اسلوب میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ بارہ دریوں، دروازوں، شہ نشینوں، حویلیوں، مکانوں اور جھونپڑوں کے اندر رہنے والے لوگ اپنی قدامت پرستی کی روش پر چل رہے تھے۔ سرِ شام گھروں میں جھاڑ، فانوس، لالٹین اور تیل کے دیے روشن ہو جاتے تھے۔ داستان گو داستانیں سنانے لگتے تھے۔ دسترخوانوں پر چپاتیاں، پراٹھے، پلاؤ قورمے، کباب دالیں، سبزیاں اور حلوے چن دیے جاتے تھے۔ وقفے وقفے سے توپ چلتی تھی۔ بادشاہ ہر روز تخت پر جلوس فرماتا تھا۔ شہزادے، درباری، مشیر آداب بجالاتے تھے۔ مجرا کرتے، نذریں پیش کرتے تھے۔ ایوانِ شاہ مین ''حضرت بادشاہ سلامت'' کی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ جاگیرداری روایات اور زوال کے کہرے میں ملفوف دلی شہر آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ دلی کی گلیوں اور بازارون میں امرا کے مراتب کا اعلان کرنے والی ایک آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی اور وہ امرا کی ڈیوڑھیوں میں بجنے والی نوبت کی صدا تھی جو وقفے وقفے سے بلند ہو کر کسی امیر کے اقبال کا اعلان کرتی تھی۔ امرا جب گھروں سے برآمد ہوتے تو ان کے مقام و مرتبہ کے مطابق جلوس کے ساتھ پیدل، گھوڑسوار اور ہاتھی چلتے تھے۔ امرا کے لیے گلیوں میں پیدل چلنا خلافِ تہذیب سمجھا جاتا تھا۔ وہ پالکیوں، تالکیوں یا تختِ رواں پر نظر آتے تھے۔

ایملی (Emily) نے اپنی یاداشتوں میں دلی کو بہت محبت سے اید کیا ہے اسی لیے وہ کہتی ہے کہ دل درحقیقت ایک بہت خوب صورت شہر تھا۔ اس کے اطراف میں سنگِ سرخ کی ایک عالی شان دیوار تھی۔ اس دیوار کے اوپر نہایت خوش وضع حصار بندی تھی۔ فصیلِ شہر سے داخلے کے لیے پانچ یا چھ نفیس دروازے تھے۔ بڑے دروازوں کے نام کابلی دروازہ، موری دروازہ، لاہوری دروازہ، کلکتہ دروازہ اور دلی دروازہ تھے۔ ایک آبی دروازہ بھی تھا جو قلعہ سے متصل دریا کے پاس تھا۔

ہمارے گھر کے قریب والے دروازے کا نام کشمیری دروازہ تھا۔ ہر بار شہر میں جانے کے لیے ہم اسی دروازے سے گزرتے تھے۔ ہمارا گھر شہر کی فصیل سے ایک میل دور تھا۔ شاہجہاں کے بنائے ہوئے اس دروازے کی فصیل میں ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شگاف ڈالنے کے بعد انگریز فوجیں دلی میں داخل ہوئی تھیں۔ اس کے بعد اس شکستہ دروازے کی مرمت نہ کروائی گئی تھی۔

میں دلی کی گلیوں میں سواری پر جاتے ہوئے لطف اندوز ہوتی تھی۔ میرے لیے یہاں کی ہر چیز ان دنوں نئی اور متاثر کرنے والی تھی۔ سنگ مرمر اور سنگِ سرخ کی عمارات بہت شان دار تھیں۔ دکانیں بہت جاذب نظر تھیں۔ کھڑکیوں اور گلی کے ایک طرف سے دوسری طرف تک لٹکتے ہوئے سوتی کپڑوں کے رنگ نہایت حسین معلوم ہوتے تھے۔ ملبوسات بہت قابل دید

Scanned by CamScanner

تھے اور ان گلیوں میں آنے والے لوگوں کی معمولی بھیڑ دکھائی دیتی تھی اور ہمارے دو سائیس سڑک کو صاف کروانے کے لیے گاڑی کے آگے سواری کرتے تھے۔

دلی کا چاندنی چوک شہر کا بڑا مرکز تھا۔ ایملی لکھتی ہے کہ اس پر رونق بازار میں تیوہاروں کے موقع پر بھیڑ بھاڑ کا یہ عالم ہوتا تھا کہ بچے لوگوں کے سروں پر چلتے ہوئے جا سکتے تھے اور انگلینڈ سے آنے والوں کے لیے یہ منظر بڑا حیران کن ہوتا تھا۔ سن ستاون کے بعد یہ مناظر اجڑ گئے مگر شہر کی دوبارہ آبادی کے بعد بھی وہ شادماں دن واپس نہ آ سکے۔ چاندنی چوک قابلِ دید بازار تھا۔ یا س سونے چاندی کا کام کرنے والوں کی دکانیں تھیں۔ ان کی دکانوں میں زیورات کی نمائش نہیں کی جاتی تھی۔ یہ چیزیں دکان کے عقب میں ڈبوں میں بند رکھی جاتی تھیں۔ یہاں کاری گر اپنے کام میں مصروف نظر آتے تھے۔ میرا باپ ان مقامی دکانوں میں جانے کے لیے کبھی اجازت نہ دیتا تھا۔ مگر ۱۸۷۲ء میں وہ برطانوی خواتین کے ساتھ چاندنی چوک میں گئی تھی جہاں انہوں نے خریداری کی تھی۔ ایملی نے ایک دکان دار سے پوچھا تھا کہ کیا اس کے پاس بادشاہی دور کے کچھ ایسے زیورات ہیں جو محلِ شاہی کی خواتین کے استعمال میں تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ان کے پاس لوٹ کا مال ضرور ہوگا۔ مجھے انہوں نے کچھ ایسی نادر چیزیں دکھائی تھیں جو اس سے پہلے میں نے نہیں دیکھی تھیں۔ یہ فیروزے، موتی، ہیرے، یاقوت اور نیلم کی چوڑیاں تھیں۔ ایملی نے چاندنی چوک کا ایک دل چسپ واقعہ بھی لکھا ہے۔ ایک بار ہم لوگ ایک دکان میں کچھ زیور دیکھ رہے تھے کہ ایک آدمی آیا اور اس نے ہمارے سروں کے اوپر سے سنار کا وایک آنکس تھما دیا جو وہ دلی کے بادشاہ کے مہاوت کے پاس ہوتا تھا۔ یہ دو فٹ لمبی ایک چھڑی تھی۔ اس پر یاقوت اور سونے کا خوب صورت کام تھا۔ ہاتھی کے سر میں چبھونے کے لیے مہاوت جو نوک دار آلہ استعمال کرتا تھا وہ نہایت نفیس فولاد کا بنا ہوا تھا اور اس پر سونے کی کندہ کاری کی گئی تھی یہ سنگِ سلیماں سے مرصع تھا۔ اور چھڑی کی گھنڈی سنگ یمانی سے آراستہ تھی۔ میجر ایڈورڈ برک (Maj. Edward Burke) نے کہ جو ہمارے ساتھ تھا فی الفور اس پر قبضہ کر لیا اور کہا کہ یہ شاہی آلہ وائسرائے کے پاس ہونا چاہیے اس کے مالک کو بتایا کہ اس کی قیمت وصول کرنے کے لیے وہ وائسرائے کے خیمے میں کا ئے۔ بالآخر یہ انکس کاؤنٹ والڈسٹین (Count Waldstein) کی ملکیت میں چلا گیا جو اسے پراگ (Prague) لے گیا۔

ایملی نے دلی کی جامع مسجد کو یہاں کی بے حد شان دار عمارتوں میں شمار کیا ہے۔ وہ کہتی ہے پورے ہندوستان میں اس جیسی مسجد نہیں ملتی ہے۔ مسجد تک جانے کے لیے تین اطراف سے سنگِ سرخ کی سیڑھیاں بنائی گئی ہیں جو سڑک کی سطح سے اوپر تک جاتی ہیں۔ مسجد کا صحن بہت اعلیٰ درجے کا ہے یہاں پانچ ہزار نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ مسجد کے تین اور خوب صورت گنبد ہیں جو سفید سنگِ مرمر کے ہیں جن پر سیاہ رنگ کی دھاریاں ہیں۔ مسجد کے بلند مینار سفید سنگ مرمر، سنگ سرخ اور سیاہ مرمر کے امتزاج سے بنائے گئے ہیں۔ مسجد کی ایک خوب صورت دیوار سنگِ سرخ کی ہے جو صحن کے اردگرد بنی ہوئی ہے۔ ایملی نے مسجد کے بڑے دروازے کی بالائی منزل میں جا کر رمضان کے آخری روز صحنِ مسجد کی رونق کا نظارہ کرنے کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اس روز پانچ ہزار کے قریب لوگ کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے۔ وہ سب کے سب صحنِ مسجد میں سفید لباس اور پگڑیوں میں تھے اور مسجد کے منبر پر امام پوری آواز سے اپنا پیغام آخری صف کے آخری نمازی تک پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب نماز شروع ہوئی تو ہر شخص سجدے میں نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک عجیب اور پر جوش نظارہ تھا۔ نماز ختم ہونے کے بعد جب مختلف دروازوں سے لوگ باہر نکل رہے تو خاموشی ختم ہو چکی تھی اور لوگ خوب زور سے ٹہر ٹہر بول رہے تھے۔ یہ بھی عجیب منظر تھا۔ مگر ایک اور عجیب منظر یہ تھا کہ پانچ ہزار نمازی مسجد کی سیڑھیوں پر اپنے چمڑے کے جوتے ڈھونڈنے میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ ایملی کے لیے یہ ہمیشہ سے معمہ رہا کہ تقریباً ملتے جلتے انداز کے جوتوں میں وہ لوگ کس طرح سے اپنا جوتا تلاش کر لیتے تھے۔

Scanned by CamScanner

ایملی کی یادداشتوں کا سلسلہ کسی رسمی خاتمے کے بغیر بالکل اچانک بیگم سمرو کے بیان اور دلی کی ریزیڈنسی میں مقامی طلبہ کے لیے قائم ہونے والے کالج کے مختصر بیان پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ بیان دلی کالج کے بارے میں ہے جس کا پرنسپل اسپرنگر (Springer) تھا۔ اس کے بعد ایم ایم کے (M M K) نوٹس ہیں جو اس نے ایملی اور خاندان کے دوسرے لوگوں کے سودات سے مرتب کیے ہیں۔

دلی میں ٹامس منکاف کی وفات پراسرار طور پر نومبر ۱۸۵۳ء میں ہوئی تھی۔ منکاف خاندان اور کمپنی کے عملے کو یقین تھا کہ اس کی موت زینت محل کی سازش سے ہوئی ہے اور منکاف کو ہندوستان کے کسی روایتی زہر سے ہلاک کیا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ زینت محل اپنے بیٹے شہزادہ جواں بخت کو بہادر شاہ ظفر کا جانشین بنوانا چاہتی تھی اور اس مقصد کے لیے اس نے سر توڑ کوششیں کی تھیں جنہیں کمپنی نے مسترد کر دیا تھا۔ زینت محل یہ سمجھتی تھی کہ جواں بخت کی جانشینی کے راستے میں منکاف نے رکاوٹیں پیدا کی تھیں اس لیے اس نے منکاف سے انتقام لیا تھا۔

''گولڈن کام'' انیسویں صدی کی دلی کے بارے میں ایک بہت اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ دلی کی یورپین سوسائٹی، تاریخی عمارتوں، بازاروں اور مشہور لوگوں کے بارے میں ایملی نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف تہذیب و معاشرت بلکہ ادبی تاریخ کے پس منظر کے لیے ایک عمدہ ماخذ ہے۔ یہ کلونیل (Colonial) دلی کا زمانہ تھا اس کلونیل حکمرانوں کے بارے میں بھی یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ٹامس منکاف کی روزمرہ زندگی کے بارے میں ایملی نے جو یادداشتیں قلم بند کی ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران اپنی روزمرہ زندگی کس طرح پر گزارتے تھے ان کے شب و روز کیسے گزرتے تھے اور ان کی مصروفیات کس قسم کی ہوتی تھیں اور ان کے ملازمین کے فرائض کیا ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں ایملی کے بیانات بہت دل چسپ ہیں مثلاً ٹامس منکاف کی گھر سے روانگی کے وقت ملازمین کس قسم کے فرائض انجام دیتے تھے ایملی نے اس کا ایک زندہ منظر نامہ پیش کیا ہے۔

اس کتاب کا سب سے قابلِ قدر مواد مصوری کے نمونوں پر مشتمل ہے۔ یہ نمونے آخری مغل دور کے منی ایچر (Miniature) کو سمجھنے کے لیے ایک نادر مواد کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس فن سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ''گولڈن کام'' ایک خزانے سے کم نہیں ہے۔ مصوری کے نمونوں کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ ۱۸۴۴ء تک دلی کی جن مشہور تاریخی عمارتوں کے مرقع بنائے گئے تھے ان میں سے بہت سی عمارتیں شائد اب موجود نہیں ہیں مگر ''گولڈن کام'' کے اوراق پر وہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گئی ہیں۔ ایملی کی یادداشتوں میں دلی کے اشرافیہ کی ثقافت کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ۱۸۴۸ء میں انگلستان سے واپسی کے دو سال بعد اس کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ شوہر کے ساتھ دلی سے رخصت ہو جاتی ہے۔ ان دو برسوں کے دوران اس نے یورین اور اینگلو انڈین سوسائٹی کو جس حال میں دیکھا تھا اس کا تذکرہ تو اس نے خوب کیا ہے، مگر دلی کے اشرافیہ کا حال نہیں لکھا۔ دراصل ٹامس منکاف، ایملی کو صرف اپنی پسند کے دوستوں سے ملواتا تھا اس لیے وہ دلی کے اصل لوگوں کی ملاقات سے محروم رہی اور ہم اس موضوع پر اس کی باتیں سننے سے محروم رہ گئے ہیں۔

Scanned by CamScanner

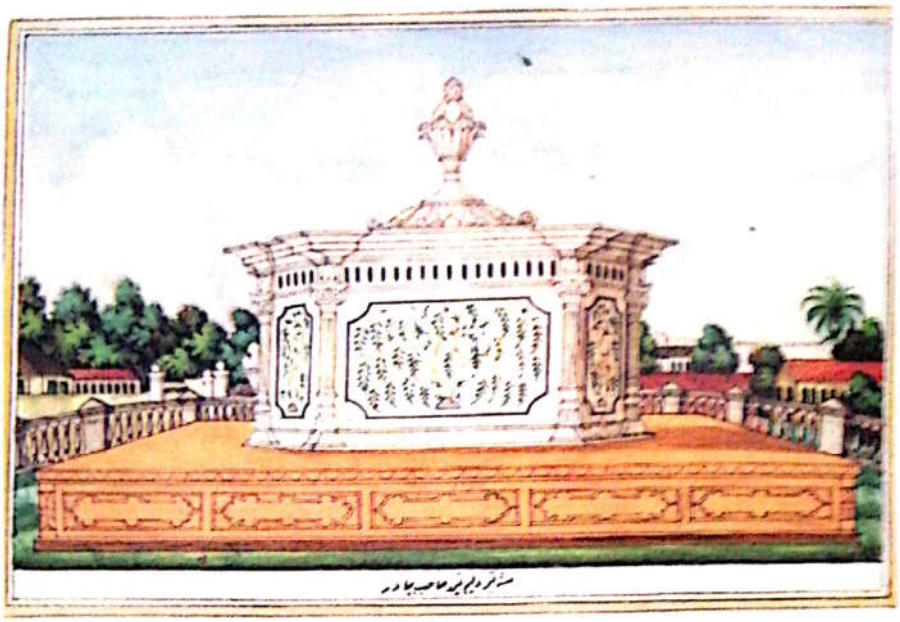

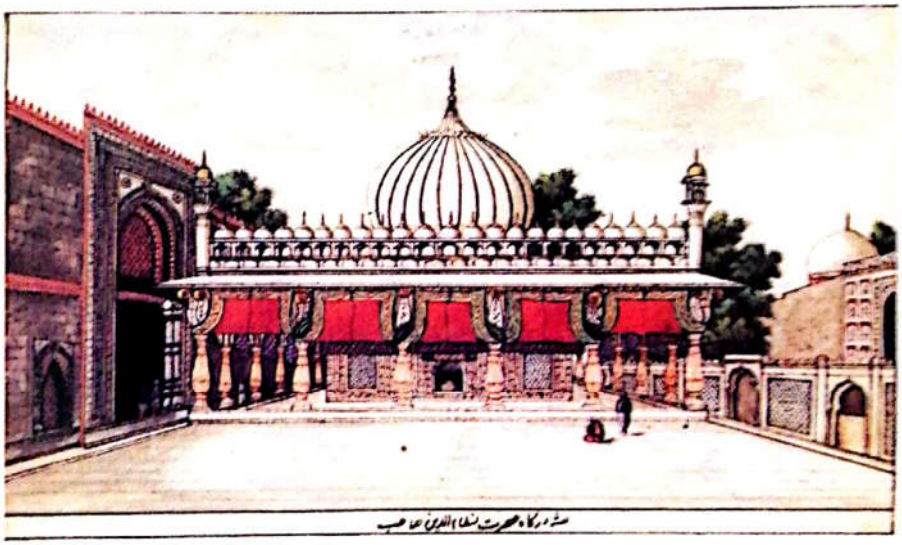

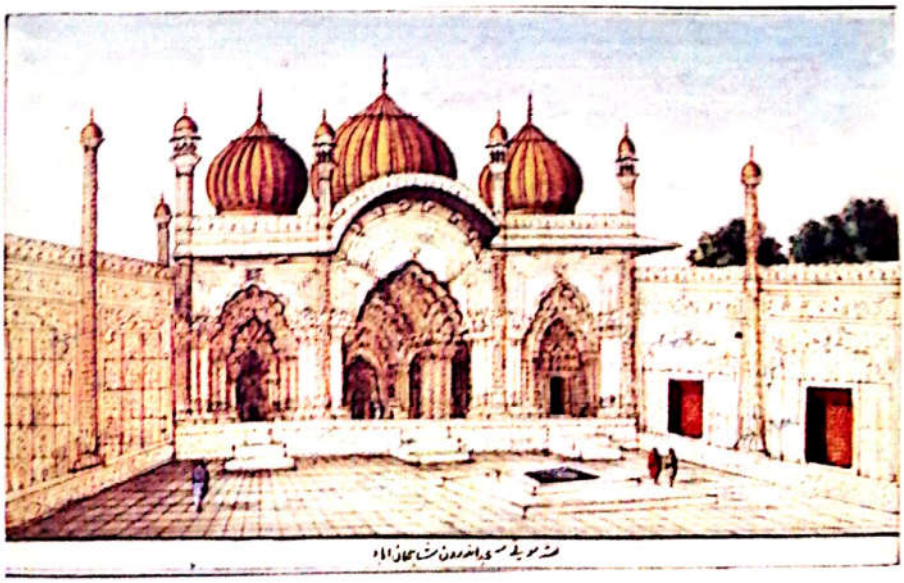

Scanned by CamScanner

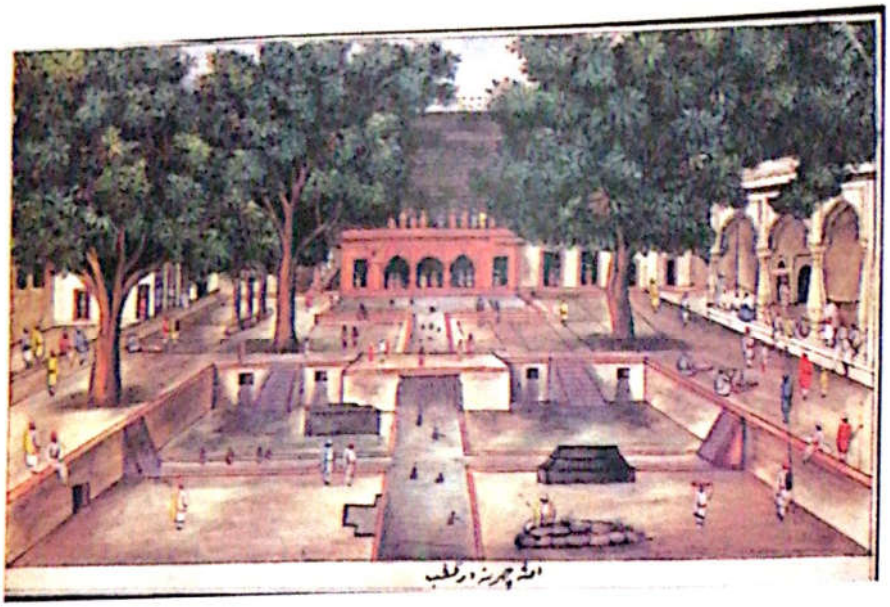

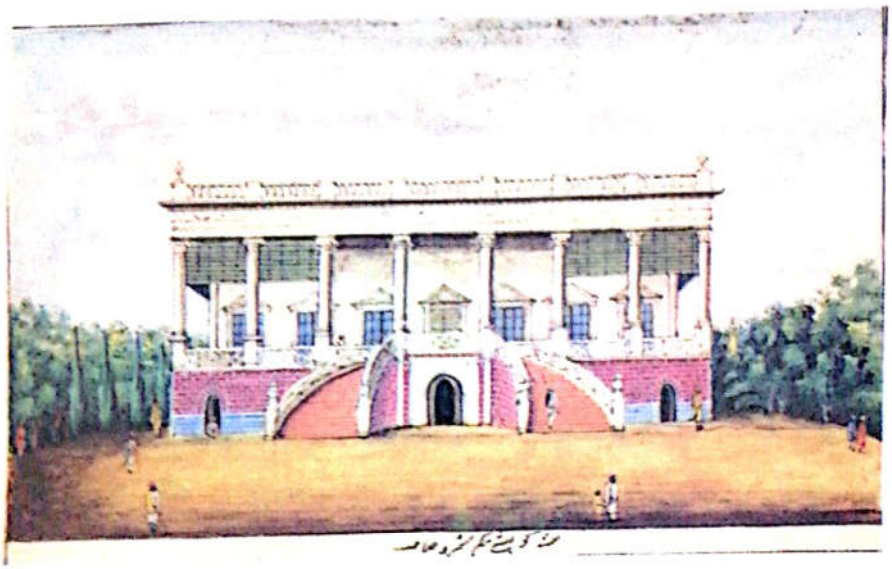

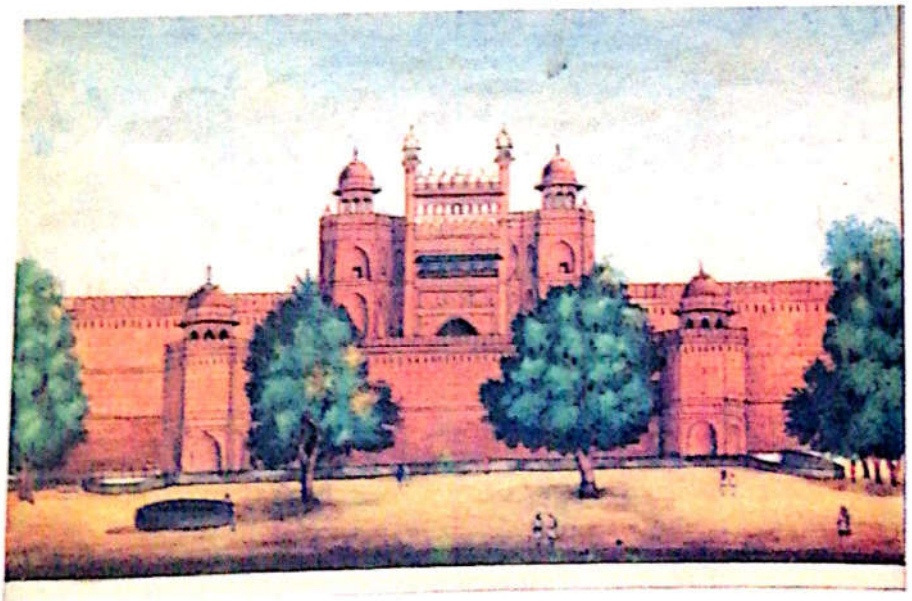

Scanned by CamScanner

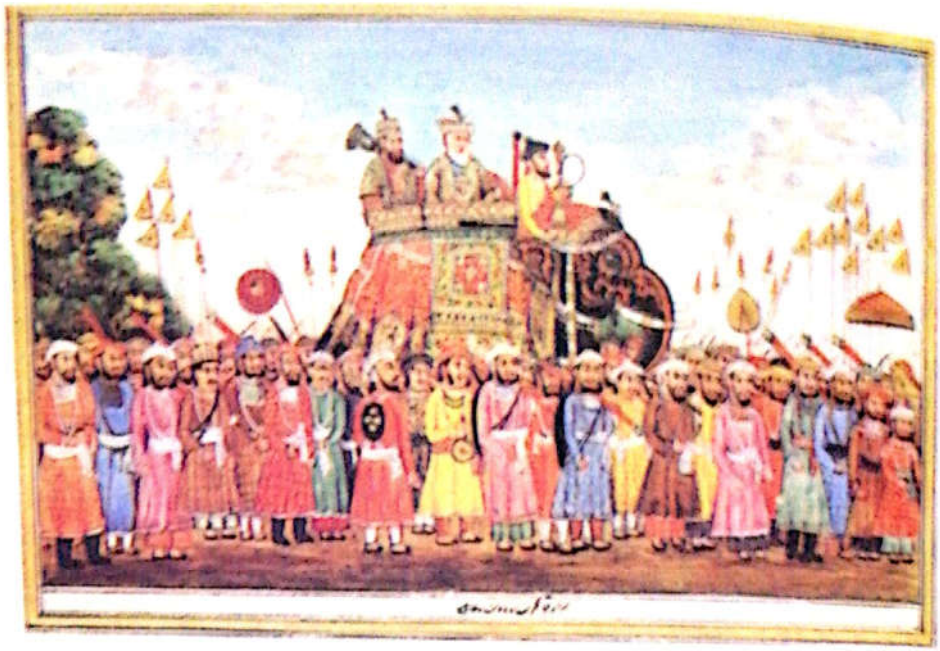

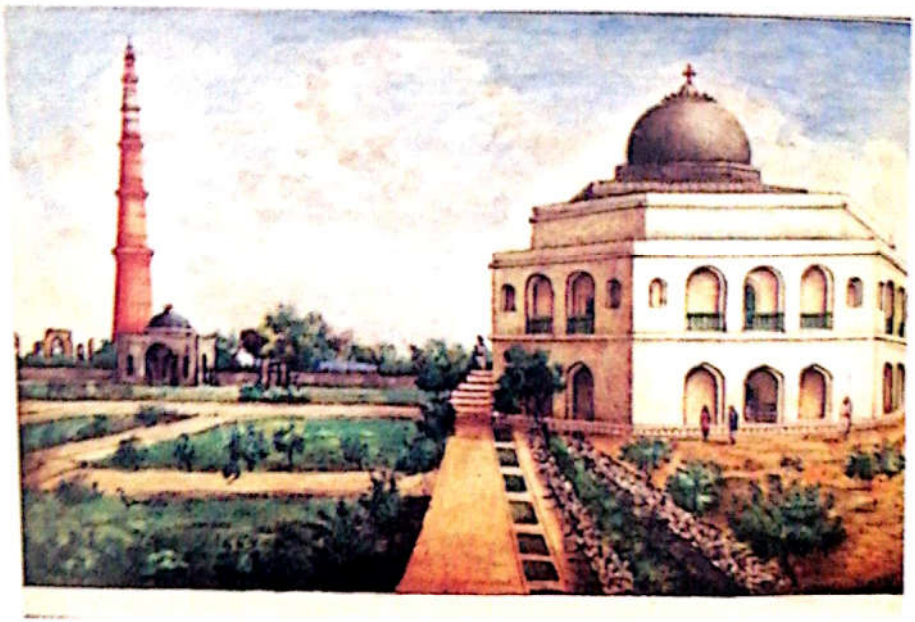

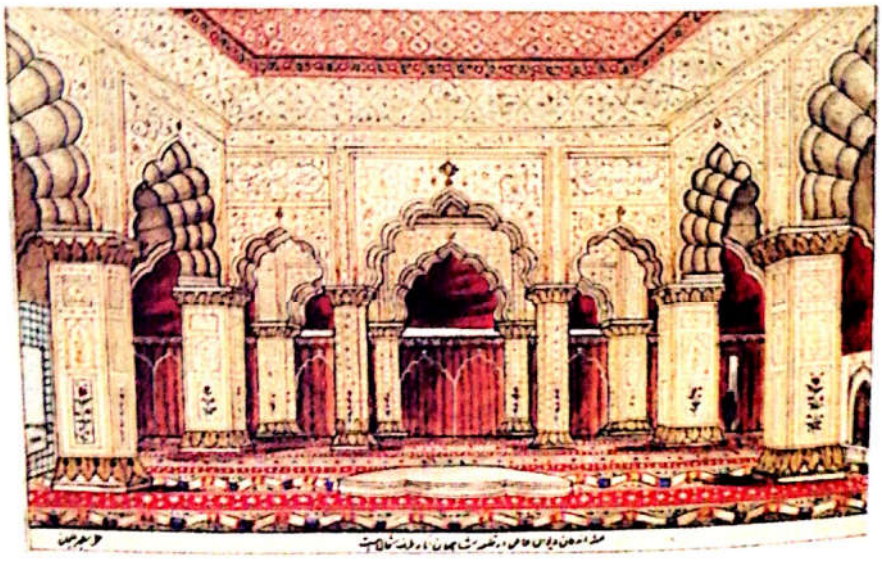

Scanned by CamScanner

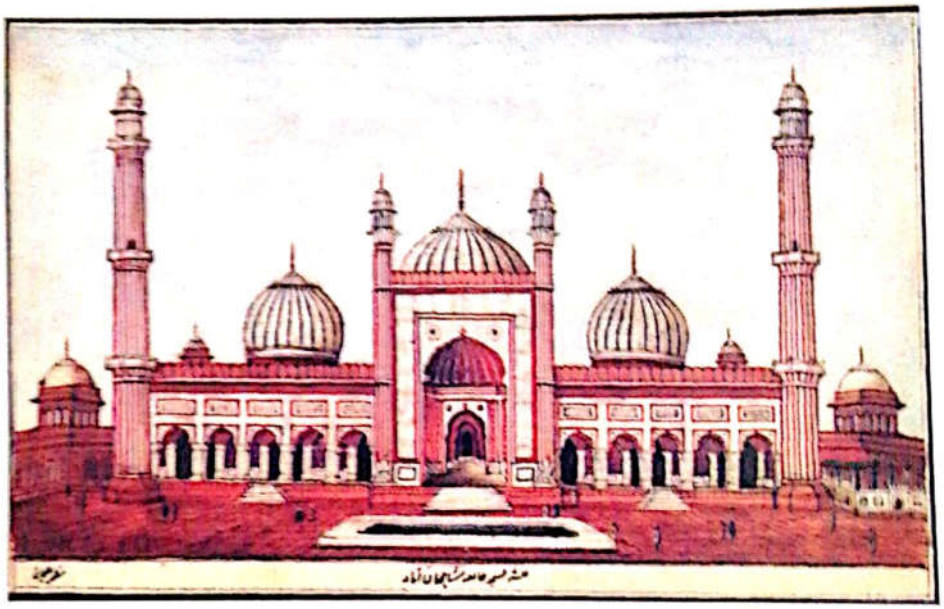

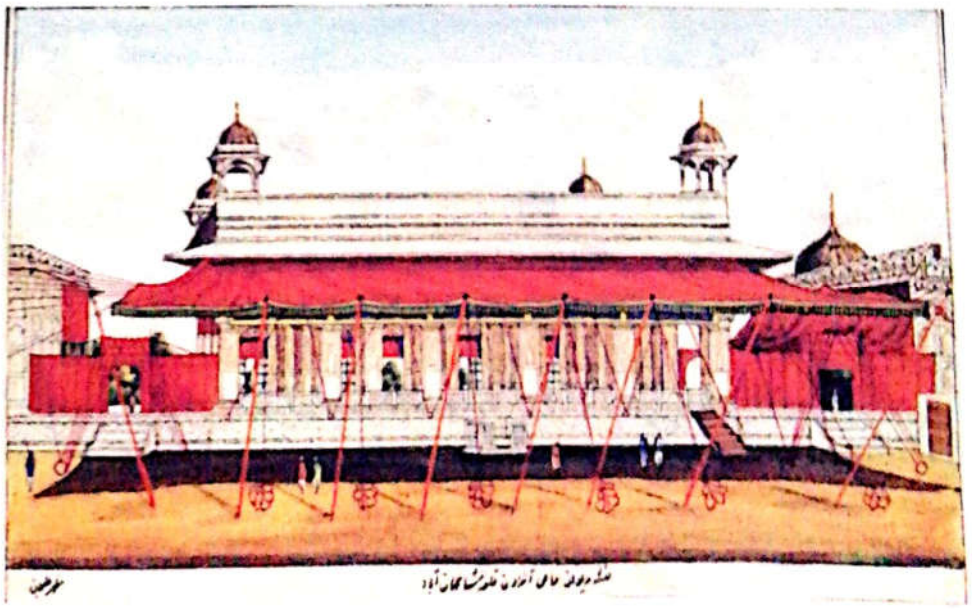

Scanned by CamScanner

حوالہ جات

۱۔ تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص ۶۳۹-۶۳۸

۲۔ ایضاً، ص ۶۹۰-۶۸۹

مصادر

1. M. M. Kaye, (ed), The Golden Calm, England, Wehb & Bower, 1980
2. Percival Spear, Twilight of the Mughals, Delhi: Munshiram Manoharlal, 1991
3. K. N. Panikkar, British Diplomacy in North India 1830-1857, Delhi: Associated Publishing House, 1968
4. S. M. Burke & Salim al-Din Quraishi, Bahadur Shah - The Last Mughal Emperor of India, Lahore: Sang-Meal Publications, 1995
5. Christopher Hawes, Poor Relations - The Making of a Eurosian Community in British India 1773-1833, Richmond Survey, Curzon Press, 1996
6. Narayani Gupta, Delhi Between Two Empires, Delhi: Oxford University Press, 1981
7. Records of the Delhi Residency, Lahore: Punjab Government Press, 1911

Scanned by CamScanner